نوآبادیاتی ہندوستان میں حقوقِ نسواں کا علمبردار: مولوی ممتاز علی

ڈاکٹر حمیرا اشفاق*

Abstract:

This paper explains the role of Maulvi Mumtaz Ali in advocating the Women's Rights in late 19th and early 20th century India. A close associate of Sir Syed Ahmad Khan and contemporary of Hali and Deputy Nazir Ahmad, Maulvi Mumtaz Ali and Sheikh Abdullah of Aligarh brought women's home journals and through them advocated women's rights including their educational rights. The paper suggests that Maulvi Mumtaz Ali suffered a lot as he appointed his wife Muhammadi begum the editor of journal Tehzeeb-Un-Niswan, launched in 1898. He strongly believed in gender equality in all spheres of life. His book "Huqooq -e-Niswan" (Women's rights) covers the vast themes of -the false superiority of male over female; women's education, purdah (Veil), marriage system and social patterns between husband and wife. He denounced the men's false superiority, physical as well as intellectual over the women. The paper explores his support to women's education. He also elaborates the debate on purdah and its violence on women by the Muslim society of colonial India.

نوآبادتی ہندوستان میں جدیدیت کی تحریکیں بڑی تیزی سے تمام سماجی ڈھانچے پر اثرانداز ہو رہی تھیں۔ جن میں تعلیم، مذہب اور دیگر کئی شعبوں میں احیاء کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کئی دانشور اور مفکرین مسلم معاشرے کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی کی روح پھونکنے میں مصروفِ عمل تھے۔ جن میں سرسید احمد خان کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ ان کے نظریات کی گونج انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف تک بآسانی سنی جا

* شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

سکتی ہے۔ان کے افکار اور نظریات نے کٹر روایت پسند معاشرے میں ہلچل پیدا کر دی۔مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کی کو شش کرنے والے یہ مفکرین خواتین کی تعلیم و ترقی کے بارے میں دو دھاروں میں بٹے نظر آتے ہیں جن میں ایک طرف سر سید احمد خان،مولوی نذیر احمد اور الطاف حسین حالی اور دوسری طرف مولوی ممتاز علی (۱) اور شیخ عبداللہ (۲) تھے۔ جو خواتین کی با قاعدہ تعلیم کے نہ صرف حامی ہیں بلکہ عملی اقدام کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں مؤخر الذکر احباب نے تعلیمی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی علمی تربیت کے لیے الگ ادبی جرائد ''تہذیب النسواں (۳)''اور رسالہ ''خاتون''(۴) بھی شائع کیے۔ یہ ادبی جرائد بلا شبہ خواتین کی ذہنی اور علمی ترقی میں اہم ثابت ہوئے لیکن ان کے مدیران کو بے انتہا طعن و تشنیع کا سامنا رہا۔مجلّہ ''تہذیب النسواں'' کے اجراء کے موقع پر تو معاملہ گالم گلوچ تک جا پہنچا کیونکہ ایک تو زنانہ اخبار دوسرا مولوی ممتاز علی نے اس کی ادارت کی ذمہ داری اپنی اہلیہ محمدی بیگم (۵) کے سپرد کر دی تھی۔کسی خاتون کا نام بطور مدیر دیکھ کر کٹر روایت پسند طبقے نے شدید رد عمل کا اظہار کیا،اس رسالے کو بند کروانے کے لیے کئی طرح غیر اخلاقی ہتھ کنڈے اختیار کیے گئے مگر مولوی ممتاز علی اور محمدی بیگم کے ارادے پست نہ ہوئے۔

مولوی ممتاز علی نے طبقۂ نسواں کے حقوق کے تحفظ اور بیداریٔ شعورِ نسواں کے لیے کئی مضامین تحریر کیے جو خواتین کے معاصر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ان کا شمار ان اولین حقوقِ نسواں کے علمبرداروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس دور کی خواتین کے حقوق کے حصول کی جنگ میں ہراول دستے کا کام سرانجام دیا۔انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں نوآبادیاتی ہندوستان کے افق پر ابھرتا ہوا سورج تبدیلیوں کی نوید بن کر ابھر رہا تھا لیکن اجہالت اور توہم پرستی عام تھی۔مولوی ممتاز علی جب اپنی تصنیف ''حقوقِ نسواں'' کا مسودہ لے کر سر سید کے پاس پہنچے تو انہوں نے سختی برہمی کا اظہار کیا۔سر سید سے دلی عقیدت اور ذہنی رفاقت کے باوجود انہوں نے خواتین کے لیے جذبۂ ہمدردی کو ماند نہ پڑنے دیا اور اپنا مشن جاری رکھا۔وہ اس بات پر کامل یقین رکھتے تھے کہ نصف سے زائد آبادی کو جاہل رکھ کر کوئی قوم ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی اس لیے وہ سر سید کے اصلاح معاشرہ کے تصور میں اپنی اس فکری اپج کو معاون سمجھتے تھے۔سر سید احمد خان اپنے معاشرے کی فرسودہ روایات کے ساتھ ٹکر لینے کی صلاحیت تو رکھتے تھے البتہ مصلحت کے پیشِ نظر ابھی وہ خواتین کے حقوق کی آواز اٹھا کر مزید کسی ردِ عمل کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔تا کہ ان کے مجموعی نصب العین کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔حتیٰ کہ شیخ عبداللہ کو پہلی لیڈیز کانفرنس کے قیام کے لیے علی گڑھ کالج کے قریب جلسہ منعقد کرنے کی اجازت تک نہ دی گئی۔اس واقعے کا ذکر شیخ عبداللہ اس طرح سے کرتے ہیں۔

''جب جلسہ کی تاریخ میں صرف دس بارہ دن رہ گئے تو ایک روز کسی ٹرسٹی صاحب کا باہر

سے خط آیا کہ اگر کالج میں بی بیوں کی کانفرنس کی اجازت دی جائے گی تو قوم نہایت سخت ناراض ہوجائے گی۔شام کو جب میں نواب صاحب (محسن الملک) مرحوم سے ملا تو انھوں نے۔۔۔اپنی رائے زنانہ کانفرنس کے خلاف ظاہر کی (۶)

''لڑکیوں کے لیے سکول بنانے کا معاملہ سامنے آیا تو شیخ عبداللہ کو صرف صاحب زادہ آفتاب احمد خان صاحب اور مولوی ممتاز علی صاحب کی تائید حاصل ہوئی۔جبکہ سرسید اور ان کے چند رفقائے کار نے اس عمل کی سخت مخالفت کی۔(۷)

مولوی ممتاز علی نے معاشرے کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے اصل مسئلے کا کھوج لگانے کی کوشش کی۔وہ اپنے اردگرد پھیلی جہالت کو کسی بیرونی طاقت کی بجائے اندرونی تبدیلی سے رفع کرنا چاہتے تھے۔وہ جان گئے تھے کہ کوئی بھی قانون اس وقت تک کارگر نہیں ہوسکتا جب تک اس معاشرے میں یہ شعور بیدار نہیں ہوجاتا کہ یہ ان کے فائدے کے لیے بنایا گیا ہے۔نوآبادیاتی ہندوستان میں خواتین کی تعلیم اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے قاعدے اور قوانین تو وضع کیے جارہے تھے لیکن صدیوں سے توہم پرستی کے شکار معاشرے میں ان کی پاسداری یا احترام مشکل نظر آتا تھا۔

''عورتوں کی اصلاح، تعلیم اور ان کی بہبود و فلاح کی جو پُرخلوص خدمات انھوں نے انجام دیں، ان کی وجہ سے وہ سارے پنجاب اور یوپی میں بلکہ مدراس اور دکن تک میں ''عورتوں کے سرسید'' مشہور تھے۔''(۸)

وہ حقوقِ نسواں کے بہت بڑی حامی اور متوازن معاشرے کی طرف قدم بڑھانے والے مفکر تھے۔میری دانست میں ان کا کارنامہ سرسید سے بھی زیادہ اہم ہے کیونکہ نصف سے زائد آبادی (خواتین) کو جبری قید میں رکھ کر رسم و رواج کے پردے میں ان کو تمام انسانی حقوق سے محروم کر کے کوئی بھی صحت مند معاشرہ وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔اس لیے انھوں اس طبقۂ مظلوم کی وکالت کا بیڑا اٹھایا۔اگرچہ یہ منزل دشوار تھی مگر انہوں نے اپنی عملی زندگی میں بھی اس کی مثال قائم کی۔

مولوی ممتاز علی نے معاشرے کے دو اہم ارکان مرد اور عورت کو ایک مثبت طریقے سے برابری کی بنیاد پر چلنے کا راستہ تجویز کیا، انھوں نے اسلام کی روشنی میں مسلم معاشرے میں عورت کے مقام اور تعمیرِ معاشرے میں اس کے کردار کو اسلامی قوانین کے مطابق ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

وہ اپنے اردگرد پھیلے سماجی ڈھانچے کو پرکھتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مذہب کی غلط تشریح اور تعبیر کر کے خواتین کا استحصال کیا جارہا ہے، وہ چاہتے تھے کہ ان توہمات کا خاتمہ کیا جائے جو محض مفروضے ہیں اور ان کا اصل اسلام کی روح کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

مولوی ممتاز علی کی کتاب ''حقوقِ نسواں''، اس ضمن میں بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔اس کتاب کی وجۂ

تصنیف بلا شبہ وہ عوامل ہیں جو عورت کو مذہب کے نام پر دبانے اور اور کے ساتھ ناروا انسانی رویوں کا باعث تھے۔انہوں نے مذہب کے نام پر پھیلائی گئی غلط فہمیوں کو قرآن وحدیث کی روشنی میں رفع کرنے کی کوشش کی۔وہ عورت کے بارے میں اسلام کی اصل تعلیمات کو واضح کرتے ہوئے اپنے معاصر معاشرے کے مبتذل رویوں کی نفی کرتے ہیں۔وہ اس کتاب کے دیباچے میں ان ممکنہ مخالف رویوں کی پیش گوئی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔۔میں خوب جانتا ہوں کہ ان خیالات کو انگریزی کی تقلید اور اس سے بھی زیادہ کریہ کریہ (کریہہ کریہہ) ناموں سے موسوم کیا جائے گا۔سیکڑوں قلم اس کی تردید اور میری تضحیک میں اٹھیں گے اور جو کچھ سزا و ناسزا انسان کے دو ہونٹوں سے نکل سکتا ہے وہ میرے حق میں نکلے گا۔۔۔۔اگر میری اس ناچیز تحریر کے اثر سے تمام ہندوستان میں ایک بڑھیا کے حق کی بھی حفاظت ہو جائے گی تو میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنا صلہ بھر پایا''۔(۹)

اس کتاب میں عقلی اور نظری بنیادوں پر خواتین کے حقوق کی پامالی کے خلاف منطقی انداز میں آواز بلند کی گئی ہے۔کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے حصے کا عنوان ہی اپنے اندر احتجاج کی لے لیے ہوئے ہے۔یعنی ''عورات (عورتیں) اور ان پر مردوں کی جھوٹی فضیلت''۔دوسرا حصہ ''عورتوں کی تعلیم، تیسرا ''پردہ''، چوتھا حصہ ''طریقِ ازدواج'' اور پانچواں ''معاشرتِ زوجین'' کے عنوانات پر مشتمل ہیں۔(۱۰)

کتاب کے پہلے حصے میں مولوی ممتاز علی، ہندوستانی معاشرے میں پھیلی توہمات کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں مختلف تاویلوں سے عورت کو مرد سے کم تر اور کم عقل دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ان میں سے ایک عورت کے استخوان کو مردوں کی نسبت کمزور جاننا اور ذہنی طور پر مردوں کی نسبت خواتین کو کم تر سمجھنا ہے۔مندرجہ بالا رائے کو منظم کرنے کے لیے ایسے تائیدی بیان لیے گئے۔مثلاً عورت کو نبوت کے انعامِ الٰہی کا ذہنی ضعف کی وجہ سے حقدار نہیں سمجھا گیا، اسی طرح دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر قرآن وحدیث کی روشنی میں ثابت کرنا یا پھر عورت کا مرد کی نسبت جائداد میں نصف کا حقدار قرار پانا۔(۳) انہی مفروضوں کی بنیاد پر خواتین کو ناقص العقل قرار دیتے ہوئے ان نے تمام انسانی حقوق یا امورِ سلطنت کو چلانے کے اہل نہ سمجھنے جیسی توہمات نے جنم لیا جن سے عورت کو معاشرے کا ایک ناکارہ پرزہ سمجھ کر اندھیری کوٹھڑیوں میں ڈال دیا گیا۔عورت اور مرد کے درمیان طاقت کی بنیاد پر تخصیص کے جواب میں مولوی ممتاز علی کا استدلال دلچسپی کا حامل ہے۔ان کے مطابق:

> ''عورتوں اور مردوں میں مقابلہ کرنے کی یہ ہی دلیل اگر مردوں اور چوپایوں میں مقابلہ کرنے کے لیے یوں قائم کی جائے کہ چونکہ چوپایوں کو خدا نے مردوں سے زیادہ طاقتِ جسمانی بخشی ہے اس لیے ان کو مردوں پر فوقیت و فضیلت حاصل

ہے۔۔۔اگر گدھے میں ایسا بھاری بورا اٹھانے کی طاقت ہے جو مرد نہیں اٹھا سکتا، اس امر سے گدھا اپنی فضیلت ثابت نہیں کرسکتا۔۔۔(۱۲)

دوسرے اعتراض کا جواب یہ دیتے ہیں کہ عورت اور مردوں کے استخوان کا فرق یعنی کم یا زیادہ کا ذکر ثابت ہے لیکن کہیں بھی 'دماغ' کی ہیئت کا فرق بیان نہیں کیا گیا۔

وہ عورت کی ذہنی استعداد کو اس کے تمدنی حالات کے ساتھ جوڑتے ہوئے اس کے ساتھ غیر مساوی رویوں کو اس کے نحیف الرائے ہونے کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ مولوی ممتاز علی عورت کی جسمانی صحت کی طرف عدم توجہی کو اس کے متلون مزاج، زود رنج اور زود اعتقاد رویوں کی وجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کی علمی سبقت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جس حالت میں مردوں اور عورتوں کو مساوی سطح پر نہیں رکھا گیا اور جس حالت میں ترقی علم کے میدان میں ان کی دوڑ ایک مقام سے شروع نہیں ہوئی تو مردوں کی سبقت قرار پاسکتی ہے۔''(۱۳)

مندرجہ بالا بیان کی تائید میں وہ، زولو قوم اور انگلستان کی مثال دیتے ہیں جن میں علم کی تقدیم کی بنیاد پر عالم میں مقام متعین ہوئے ہیں۔ مولوی ممتاز علی دلیل دیتے ہیں کہ جنس کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم اور فہم و فراست کی بناء پر مقام و مرتبہ متعین ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اسلامی تاریخ سے بھی مثالیں لاتے ہیں جن میں عورت کو مرد پر سبقت حاصل ہے۔ جیسا کہ بی بی آمنہ کو، حضرت خدیجہ کو (اول اسلام لانے والی خاتون کے طور پر)، حضرت فاطمہ کو ابو لھب پر، اسی طرح تاریخِ ہندوستان کے اوراق پلٹتے ہوئے، وہ رضیہ سلطان، نور جہاں اور آخر میں (نوآبادیاتی اثرات کے نتیجے میں) ملکہ انگلستان کا بطور مدبر سلطان کے ذکر کرتے ہیں۔ بقول مولوی ممتاز علی:

''خود اس زمانہ پر غور کرنی چاہیے کہ جناب ملکہ معظّمہ قیصرِ ہند کس خوبی و حسنِ انتظام اور امن و امان کے ساتھ کشور کشائی اور دادِ گستری دے رہی ہیں، کیا اب بھی کہا جاسکتا ہے کہ سلطنت مردوں ہی کا حق ہے؟۔۔۔دنیا میں سب سے بڑھ کر طاقت علم ہے اور علم والے ہی خواہ وہ مرد ہوں خواہ عورت، جاہلوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں۔(۱۴)

سرسید سے فکری اور نظری ہم آہنگی ہونے کی وجہ سے مولوی ممتاز علی نے بھی مذہب کو سائنسی اور عقلی استدلال کے مطابق جاننے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ وہ عورت کا مذہب میں موجود تصور کو کئی جگہ عقلی توجیہات کے ساتھ پیش کرتے ہیں، مثلاً عورت کے نبی نہ ہونے کی دلیل پیش کرکے اسے کمزور اور کم عقل یا جذباتی ہونے کا طعنہ دینا مولوی ممتاز علی جیسے مذہبی سکالر کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ فرقۂ اناث میں سے کوئی نبی نہیں ہوا اس کے جواب میں مولوی صاحب بڑے مدلل انداز میں لکھتے ہیں کہ:

''اہلِ اسلام کا اعتقاد ہے کہ خدائے تعالیٰ نے خلقت کی ہدایت کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں بھیجے۔مگر ہماری کتابوں میں صرف دس پندرہ نبیوں کا حال درج ہے اور تمام عہدِ عتیق کے انبیاء بھی تعداد میں شاید تیس سے زیادہ نہ ہونگے۔پس ظاہر ہے کہ ایک لاکھ تیئس ہزار نو سو ستر انبیاء کے حالات سے ہم محض نا واقف ہیں۔اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آیا وہ سب مرد تھے یا سب عورتیں۔یا کچھ مرد اور کچھ عورتیں۔صرف چند افراد کا حال معلوم کر کے ایسی کثیر تعداد کی نسبت حکمِ کلّی لگا دینا یا کوئی قیاس ظنی قائم کرنا محض تحکم ہے۔اور جب تک ہم کو سب انبیاء کا حال معلوم نہ ہو لے تب تک اس معاملہ میں ہمیں لب کشائی کرنا مناسب نہیں ہے۔(۱۵)

اس وقت کے معاشرے حتیٰ کہ آج بھی عورت کو کم تر یا محکوم ثابت کرنے لیے کئی آیات اور احادیث کو بغیر ان کے سیاق وسباق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے،جس سے وہ معنی اخذ کیے جاتے ہیں جو اجارہ دار طبقے کو معاونت کرتے ہیں تاکہ گمراہیوں کے اڈے قائم رہیں۔اس ابہام کی وجہ برصغیر کے مسلمانوں کا عربی کا براہِ راست مطالعہ نہ ہونا بھی ہے جس سے تراجم میں اختلاف سے پیغام اپنی اصل روح کے ساتھ قاری پر منکشف نہیں ہوتا۔مولوی ممتاز علی عربی زبان کے فاضل، فارسی ادب میں کامل، انگریزی کے اعلیٰ مترجم اور اردو کے بلند پایہ ادیب تھے۔(۱۶) انہوں نے قرآن کے تراجم اور تفاسیر کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے عربی قواعد کی روشنی میں الفاظ کے متعین معنی اور ان کی غلط تعبیروں کو لغوی اور معنوی اعتبار سے واضح کیا ہے۔مثلاً

''اَلرِ جالُ قوّامُونَ علیٰ النساء بما فضل اللہ بعضھم علیٰ بعض و بما انفقوا من اموالھم جس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ مرد حاکم ہیں عورتوں پر۔کیونکہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور انہوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔آیت کی تفسیر میں مفسر لکھتے ہیں کہ مردوں میں دو قسم کی فضیلتیں ہیں۔ایک وہ جو قوت نظریہ اور قوتِ عملیہ کے قوی ہونے کی وجہ ان کو بالذات حاصل ہے۔دوسری یہ فضیلت کہ مرد عورتوں کو مصارف مثلاً روٹی کپڑا وغیرہ دیتے ہیں۔مگر ہم کو اس تفسیر کے ساتھ اتفاق نہیں کیونکہ اولاً تو ''قوام'' کا ترجمہ بلفظِ حاکم کرنا ہماری رائے میں صحیح نہیں اور مولانا شاہ عبدالقادر کے کسی نے یہ ترجمہ اختیار نہیں کیا۔شاہ رفیع الدین صاحب نے ''قوّام'' کا ترجمہ'[قیام رکھنے والا کیا ہے،ان کے والدِ ماجد شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ نے '' تدبیر کار کنندہ'' ترجمہ کیا ہے۔ایک اور فارسی ترجمہ میں جو سعدی کے ترجمہ کے ساتھ مشہور ہے ''قوّام'' کا ترجمہ ''کارگزار'' کیا گیا ہے۔ثانیاً اس ترجمہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بعض کو بعض پر فضیلت دینے کا کیا مطلب۔اگر پہلے بعض سے بعض مرد مراد ہیں اور دوسرے بعض سے بعض

عورتیں تو سب مردوں کی فضیلت سب عورتوں پر ثابت نہیں ہے۔''(۱۷)

''حقوقِ نسواں'' میں دوسرا باب پردے کی ذیل میں قائم کیا گیا ہے۔ ہندوستانی مسلم معاشرے میں ''پردہ'' ایک حساس ترین موضوع رہا ہے۔ مولوی ممتاز علی نے اس موضوع کو بڑے جرات مندانہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ وہ عقلی دلائل کے ساتھ قرآن وحدیث اور تاریخِ اسلام سے حوالے بھی پیش کرتے ہیں جو پردے کے نام پر عمر قید کاٹتی ہوئی عورتوں کی شکل میں ہندوستان میں عام رواج تھا۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہو جاتی ہے کہ ''پردے'' سے مراد کیا ہے؟ مولوی ممتاز علی کے مطابق ''شرع نے جو پردہ تجویز کیا ہے وہ حیاء انسانی پر مبنی ہے(۱۸)۔ وہ زمانے کے بدلتے چلن کو دیکھتے ہوئے خواتین کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری جانتے تھے۔ جبکہ ''شرعی پردہ'' جسے محض خواتین کے استحصال کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا اس کو تعلیمِ نسواں کی راہ میں بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

''خلاف شرع پردہ سے لڑکیوں کی تعلیم کو بھی سخت نقصان پہنچتا ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم متفرق طور پر فرداً فرداً اشخاص کی کوشش سے سرانجام نہیں پا سکتی۔ بلکہ قومی تعلیم کے لئے ضرور ہے کہ عام اصول پر باضابطہ مدارس قائم ہوں اور وہ موجودہ حالت میں قائم نہیں ہو سکتے۔(۱۹)

وہ کئی مسلمان گھروں کے واقعات کو نام لیے بغیر من وعن نقل کرتے ہیں جس میں عورتوں کو بنیادی ضروریات تک فراہم نہیں کی جاتیں جبکہ مرد خود مردان خانوں میں شان وشوکت سے رہتے ہیں۔ وہ ان پردہ دار بیبیوں کو مناسب علاج، متوازن خوراک اور بہتر لباس استطاعت رکھنے کے باوجود نہیں دیتے۔ یہ مسئلہ طبقہ اشرافیہ میں زیادہ ہے کیونکہ غریب طبقے سے رکھنے والی عورت کا مذہب گھر کی کفالت ہوتا ہے اس لیے اس کو پردے میں رکھ اس کا مرد اس مفت مزدور کو آرام دہ زندگی دے نہیں سکتا۔ اس لیے غریبی کے بوجھ تلے دبے یہ خاندان عورت کے کاندھوں پر کھوکھلے ناموس کے بوجھ بھی نہیں ڈالتے۔ مولوی ممتاز علی اس دور کے اس دوہرے معیارِ زندگی پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''جو لوگ خود الپکہ کے چغے اور طلائی لنگیاں اور وارنش کے بوٹ مٹکائے پھرتے ہیں ان کے بیبیاں اور چار خانہ کے پاجامے اور تین آنہ گز کی ململ کی کرتیاں پہنتی ہیں جو لوگ گرمیوں میں برف میں لیمنڈ کی بوتلیں سرد کر کر کے پیتے ہیں اور پنکھوں اور خس کی ٹٹیوں میں استراحت فرماتے ہیں ان کی عورت کے ہاتھوں میں کھجور کے پنکھے بھی ثابت نہیں ہوتے۔(۲۰)

''کچھ شک نہیں کہ یہ خلاف شرع پردہ اسی غرض سے رکھا گیا ہے کہ ان خلاف انسانیت حرکات کو کوئی دیکھنے والا اور ان اعتراض کرنے والا نہ ہو اور اس خلاف شرع پردہ کے دور کرنے سے اس ظلم وستم پر جو تمام ملک ہندوستان میں شب و روز نوعمر

لڑکیوں اور بے کس عورتوں اور محتاج بیواؤں پر نہایت بے دردی کے ساتھ ہو رہا ہے اور جن کے رونے چلانے کی آواز چار دیواری سے باہر نہیں پہنچتی روز روشن کی روشنی پڑے گی اور اس کے انسداد کی تدبیریں عمل میں آنی شروع ہوں گی۔''(۲۱)

وہ حضرت اسماء کی مثال دیتے ہوئے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس میں وہ بوجھ اٹھائے راہ چل رہی تھیں تو رسولِ خدا نے انہیں اونٹنی پر سوار ہونے کا فرمایا۔ اس ضمن میں دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسماء جس طرح اور لوگوں کے روبرو ہوتی تھیں اسی طرح اپنے جیٹھ پیغمبر خدا کے روبرو ہوتی تھیں انہوں نے کوئی فرق پردہ کے باب میں اپنے جیٹھ یعنی پیغمبر خدا اور غیر محرموں میں نہیں رکھا تھا۔ نہ رسول خدا نے کوئی اس قسم کا فرق ان کو بتلایا کہ تم اور غیر محرموں کے روبرو تو ہوا کرو اور ہمارے روبرو ہونا موت کی برابر خطرناک سمجھو۔ ہاں وہمی مزاجوں کے وہم سے کچھ بعید نہیں کہ وہ یہ کہیں کہ ممکن ہے کہ اس وقت اسماء کے منہ پر برقع پڑا ہو اور وہ گھوڑے کو چرا کر اور بوجھ سر پر اٹھا کر برقع اوڑھے آ رہی ہوں اور پیغمبر خدا نے محض بیرونی قرائن سے ان کو شناخت کر لیا ہو مگر ان وسوسوں کا علاج بجز لاحول پڑھنے کے اور کچھ نہیں۔''(۲۳)

محرم رشتہ داروں کی موجودگی میں کسی عورت کے پاس جانے کی ممانعت نہیں ہے۔(۲۴) ان غریب ادنیٰ گھروں کی عورتیں باوجود بے علمی اور بے استطاعتی کے اپنی عصمت کو اس طرح بچا سکتی ہیں تو کیا یہ شریف زادیوں ہی کے لئے خاص بات ہے کہ وہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اور نیز اس امر کے کہ ان کے لئے ترغیبات اس قدر مؤثر نہیں ہو سکتیں جس قدر غرباء کی مستورات کے لئے اور نیز باوجود اس امر کے کہ شرفاء کی عورتوں کو جن کو نوکر چاکر رکھنے کا مقدور ہے بازاروں میں پھرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ تاہم وہ فسق میں مبتلا ہوئے بغیر نہ رہیں گی۔ ہم اپنی قوم کے معزز گھرانوں کی بیگمات کے اطوار و اوضاع کی نسبت نہایت اعلیٰ رائے رکھتے ہیں جو ہم کو ایسے ناپاک خطروں سے مانع ہے۔(۲۵)

وہ اعتبار کو سب سے بڑا پردہ تصور کرتے ہیں۔ اس قسم کے شرعی پردے جس میں خاوند کے بھائی، خسر یا کسی عزیز رشتے دار سے ملنے پر بھی پابندی ہو اور عورت کو محض ایک کمرے میں زندگی گزارنی پڑے، اس کا حکم اسلام میں شریف عورتوں کے لیے نہیں دیا گیا۔ البتہ ستّر پوشی کی تلقین واضح ہے۔ بقول مولوی ممتاز علی:

عورتیں جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر چار گواہ لاؤ۔ پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو مرتے دم تک گھر میں روکے رکھو۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح کا سخت پردہ جیسا کہ مسلمانوں میں آجکل رائج ہے خداوند تعالیٰ کے نزدیک صرف بدکار عورتوں کے لئے محض بطور سزا کے تجویز ہوا ہے۔ خداوند تعالیٰ ہر مسلمان کی

بہو بیٹی کو ایسی سزا سے محفوظ رکھے۔ **(۲۶)**

پردے کے نام پر دقیانوسی خیالات رکھنے والے لوگوں پر مولوی صاحب طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان مقاموں پر جو ریل کے جنکشن کہلاتے ہیں یعنی جہاں ریل کی ایک گاڑی میں سے اتر کر دوسری میں سوار ہونا پڑتا ہے چند مستورات کو ایک قطار میں کھڑا کر کے اور ان کے دونوں طرن متوازی چادریں پکڑ کر ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم تک اسی حراست میں لے جاتے ہیں اور تمام یورپین زن و مرد ان کی حماقت پر ہنستے اور ٹھٹھہ کرتے ہیں۔'' **(۲۷)**

یہاں تک کہ عورتوں کو ریل کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کو بھی شرعی پردے کے نام پر روکا جاتا تھا۔ سیر و تفریح تو گویا عورت کے لیے بنے ہی نہیں ہیں۔ مولوی ممتاز علی اس صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''چار دیواری مکان کے اندر دنیا کے کیا عجائبات نظر آسکتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں کی عالیشان عمارتیں، عجائب خانہ جات، چڑیا خانے۔ ریل کے کارخانے، دریاؤں کے پُل، باغات، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن کا دکھانا لڑکیوں کو ضرور ہے اور یہ سب چیزیں بے معلوم اثر دل کی توسیع اور ترقی عقل کا کرتی ہیں۔ ہم کو معلوم نہیں کہ اس بات سے کیا خوشی ہوسکتی ہے۔ کہ چالیس برس کی عورت کو اتنی بھی عقل و ہوش نہیں ہونی چاہیئے جتنی بارہ برس کے بچہ کو ہوتی ہے اور اس عقل و ہوش کی عورتیں مائیں ہو کر بچوں کو تعلیم کی بنیاد کیا اچھے اصول پر رکھ سکتی ہیں۔ **(۲۸)**

مولوی ممتاز علی گھر سے نکلنے حتیٰ کہ خواتین اور مردوں کی مجالس میں ایک ساتھ شرکت کرنے کی بھی حمایت کرتے ہیں، ان کے مطابق مردوں کی صحبتیں عورتوں کے شمول سے زیادہ نیک اور مہذب ہو جائیں گی۔ ہمارے اچھے تعلیم یافتہ نوجوان بھی جب باہم بیٹھ کر بے تکلفی کی گفتگو کرتے ہیں تو اکثر ان کی گفتگو کے مضمون غیر مہذب اور بے ہودہ ہوتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی شمولیت ان کی مجالس کو مؤدب اور مہذب اور باوقار اور مفید بنا دیں گی اور ہر شخص کو سلیقہ اور تمیز سے اور مناسب محل گفتگو کرنا آجائے گا۔ اور اس قسم کی مجالس خرد سال بچوں کے لئے عمدہ راہنمائے تربیت ہوں گی۔ **(۲۹)**

شرعی پردے کے نام پر خواتین کا لاعلاج مرجانا، گویا کسی نامحرم سے علاج کرانے سے زیادہ بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اس ضمن میں اکثر ہندوستانی خواتین بھی بطور فخر اس بات کا ذکر کرتی تھیں۔ ''بیماری کی حالت میں مستورات کو پردہ کی وجہ سے اور بھی مشکلات واقع ہوتی ہیں اور اس کی حفاظت میں جانِ عزیز کا تلف کر دینا تمغائے شرافت سمجھا جاتا ہے۔ جب کسی مریضہ کو دیکھنے کے لئے یعنی صرف نبض دیکھنے کے لئے حکیم آتا ہے تو بڑے سے بڑے لحاف کی

موٹی تہہ مریضہ کے پردہ کے لئے کافی نہیں سمجھی جاتی بلکہ مزید احتیاط کے لئے مریضہ کے پلنگ کے متوازی ایک چادر تانی جاتی ہے اور معالج اس چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر مریضہ کی نبض ٹٹولتا ہے۔''(۳۰)

مولوی ممتاز علی معاشرے کے ایک اور رویے کا بھی تمسخر اڑاتے ہیں جس میں بیوی یا اہلِ خانہ کا نام لینے سے اجتناب کی کئی صورتیں ظہور میں آتی تھیں۔''شریف شخص ڈرتا ہے کہ میں بیوی کا لفظ یا اس کا کوئی ایسا ہم معنی لفظ نہ بولوں جسے سن کر مخاطب کا ذہن یا خیال سیدھا میری بیوی کی طرف جائے بلکہ وہ ایسا لفظ استعمال کرے گا جس سے مخاطب کا ذہن اس کی بیوی کی طرف متوجہ نہ ہو۔اس غرض کے لئے عموماً بیوی کی بجائے الفاظ گھر میں سے بولے جائیں گے مثلاً بجائے اس کے کہ میری بیوی بیمار ہے کہیں گے کہ میرے گھر میں سے بیمار ہیں اگر یہ پوچھنا ہو کہ آپ کی بیوی یہاں ہیں تو اس کی بجائے یوں کہیں گے کہ آپ کے گھر میں سے یہاں ہیں۔(۳۱)'' گویا بیوی کا پردہ صرف آنکھ یا کان سے ہی نہیں کرایا جاتا بلکہ خیالات اور ذہن سے بھی کرایا جاتا ہے ہمیشہ یہ ہی ڈر رہتا ہے کہ کہیں مخاطب کے خیال کا بیوی کے ساتھ آمنا سامنا نہ ہو جائے(۳۲)۔جب کسی کی بیوی کہیں سے آتی ہے تو کہتے ہیں کہ سواریاں آئیں۔(۳۳)۔بعض لوگ خصوصاً پنجابی بیوی کی بجائے قبیلہ کا لفظ بولتے ہیں(۳۴)۔قبیلہ کے بجائے قبائل کہنے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ڈبل جمع تو ضرور کچھ ذہن اور بیوی کا آمنا سامنا روکے گی۔مگر کثرت استعمال سے آخر پھر وہی دقت پیدا ہوتی ہے۔یعنی رفتہ رفتہ قبائل بھی بالکل بیوی کا مرادف یعنی ہم معنی بن جاتا ہے۔(۳۵)۔بیچارے پردہ پوش اس لفظ پر جمع کی ایک اور تہہ چڑھاتے ہیں اور قبائل کی بجائے قبائلان بولتے ہیں(۳۶)۔زبان خلق چند روز میں ہی اس کو بھی بیوی کا ہم معنی بنا دیتی ہے اور بے چاری بیوی پھر بے پردہ ہونے لگتی ہے(۳۷)۔فی الحال اس طریق پر آنا مشکل ہے تو وہ تدریجی سبیل نکالی جائے کہ کچھ عرصہ بعد ان کو خاص طریق محمدی پر لے آئے۔(۳۸)۔مولوی ممتاز علی برقعے کے حق میں تھے،لیکن شرعی پردے کے خلاف انہوں نے کھل کر اپنے نظریات کا پرچار کیا۔وہ خواتین کا مردوں کے ساتھ جا کر خریداری کرنا یا سیر کے لیے باہر نکلنے کے حامی تھے۔وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ تقاضائے وقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے''فی الحال پردہ کے بے حد تشدد کو توڑا جائے اور اس کے لئے ایک قسم کا ضابطہ اور یک رنگی تجویز کی جائے اور ایک اس قسم کی اعتدال کی راہ نکالی جائے جو نہ آزادی کے اس پرلے کنارہ تک پہنچتی ہے جہاں مغربی تہذیب پہنچاتی ہے نہ اس میں وہ تنگی اور دقّت ہو جس سے شرعی حکم جو محض حیاداری کی حفاظت کے لئے ہے جس بے جا کی حد تک پہنچ جائے۔(۳۹)حتیٰ کہ انھوں نے تجویز دی کہ ایک خاص جمیعت بغرض اصلاح حالت مستورات اہل اسلام ہند بنائیں(۴۰)۔

ایک اور معاشرتی رویہ بچپن کی منگنی اور صغرسنی کی شادیوں پر مولوی ممتاز علی نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اصلاح کرنے کی بھرپور کوشش کی۔وہ اپنی معاصر صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ''عمر نکاح مقرر

نہیں کی یا بہت صغرِ سنی میں نکاح کیا جاتا ہے بلکہ دودھ پیتے بچوں اور کبھی کبھی بن پیدا ہوئے بچوں کا، جو ابھی پیٹ میں جنین ہوتے ہیں، رشتہ ہو جاتا ہے جو نکاح سے بھی زیادہ موکد اور ناقابل التنسیخ ہوتا ہے۔ اس قسم کے ازدواج سے صرف یہی نقصان نہیں ہوتا کہ فریقین ازدواج اس خوش معاشرتی سے جو خوشی کے انتخاب و پسندیدگی کا نتیجہ ہے محروم رہ کر ناموافقت و باہمی کدورت کی تلخی تمام عمر چکھتے ہیں بلکہ اس زبردستی کے رشتہ کے ہو جانے کے بعد نکاح بھی ایسی صغرِ سنی میں ہو جاتا ہے کہ اس وقت تک لڑکے اور لڑکی کے اعضاء کا نشو و نما اس رشتہ کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے جو بچے بچپن میں ہی شوہر و زوجہ اور چند روز بعد باپ اور ماں بن جاتے ہیں ان کی صحت کو ایسے سخت صدمے اٹھانے پڑتے ہیں کہ پھر کسی قسم کی تدبیر یا علاج سے تمام عمر اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ (۴۲)

مولوی ممتاز علی بے جوڑ شادیوں کے نتائج پر بھی سیر حاصل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ہر چند رسول خدا صلعم کا حکم موجود ہے کہ نکاح کرنے سے پہلے دیکھ لو مبادا ان میں کوئی عیب یا ایسا امر ہو جو بعد نکاح موجب ناموافق ہو مگر کون خدا اور کس کا رسول۔ یہاں فرضی ناموس، ناموس اکبر سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ لاچار شرفا کے بچے بجز کسبیوں کے اور کسی کو نہیں پاتے جو اس حکم رسول خدا صلعم کا استعمال اپنے پر ہونے دیں۔ لاچار وہ کسبیوں کو گھر میں ڈالتے اور شریف خاندانوں کو بدنام کرتے اور اپنے بڑوں کی عزت کو جو ضرور ڈوبنی چاہئے تھی ڈبوتے ہیں۔ (۴۳)

مولوی ممتاز علی نے بلا شبہ انیسویں صدی میں خواتین کے حق میں آواز بلند کر کے ایک بہت عظیم اور جرات مندانہ اقدام کیا۔ لڑکیوں کی تعلیم تربیت کے ساتھ ان کو معاشرے میں بنیادی انسانی حقوق دلوانے کی بھی حتیٰ الوسع کوشش کی۔ انھوں نے شرع کے مطابق خواتین کو جائیداد میں حصہ دینے کی بھی تاکید کی، اسی طرح حق مہر کے معاملے کو بھی معاشرتی تناظر میں دیکھتے ہوئے اس کے نہ دینے یا حیثیت سے زیادہ مقرر شدہ مہر کی وجہ سے ازدواجی تعلقات میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو پڑے مدلل اور حقائق کی روشنی میں پرکھتے ہوئے کیا ہے۔ وہ اس بات کی اہمیت بھی اجاگر کرتے ہیں کہ ازدواجی تعلقات میں بگاڑ گویا معاشرے کے توازن کا بگاڑ ہے۔ اس لیے اس امر میں ہر طرح کی چھان بین اور لڑکی اور لڑکی کی باہمی رضامندی ہونا از حد ضروری ہے۔ وہ فرضی رسم و رواج کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ شادی شدہ زندگی میں ایک دوسرے کے دل میں عزت اور احترام کیسے پیدا کیا جائے تاکہ باہمی سلوک سے زندگی کا سفر طے ہو سکے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ مولوی ممتاز علی ۲۷ ستمبر ۱۸۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں نقل مکانی کر کے ہندوستان آئے تھے۔ انھیں شمس العلماء کا خطاب بھی ملا۔ انھوں نے تعلیم کے مراحل دیوبند، راولپنڈی، سرسا، فیروز پور اور لاہور میں طے کیے۔ آپ حضرت مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند کے شاگرد حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے

ہم درس اور سر سید احمد خان کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔اس دور کے تمام مشاہیر مولانا الطاف حسین حالی، منشی ذکا اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی سے آپ کے گہرے مراسم تھے۔ادب اور انشا میں مولوی محمد حسین آزاد کو اپنا استاد مانتے تھے اور ان کی خدمت میں بہت بے تکلف تھے۔مولوی متاز علی کی تصانیف میں ''حقوق نسواں''، ''سبیل الرشاد''، ثبوت واجب الوجود''، ''خرینۃ الاسرار''، '' شیخ حسن'' (ترجمہ)، ''تذکرۃ الانبیاء''، ''ترجمۂ زاد لمعاد''، ''ترجمہ المنقذ من الضلال (از امام غزالی)، ''خیر المقال''، [ولادت مسیح (اس میں سر سید کی تقلید میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بے باپ کے نہیں ہوئی۔)''ردالملاحدۃ''،

''فارسی آموز''، ''پرائمری کے طلباء کے لیے اردو ریڈرز''، ''مڈل کے طلباء کے لیے اردو کی نصابی کتابیں''، ''بچوں کو ہندسے سکھانے کا نقشہ''، اور ''اربعین'' شامل ہیں۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ''تاج صاحب کے والدین''، مشمولہ مجلّہ صحیفہ، تاج نمبر، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، س۔ن، ص ۱۹

۲۔ شیخ عبداللہ حقوق نسواں کے حامی تھے اور علی گڑھ میں پہلا لڑکیوں کا سکول کھولنے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔''بمبئی کے اک جلسہ میں ریزولیوشن پاس ہوا تھا کہ وہ ایک مدرسہ بطور نارمل سکول کے جاری کریں گے اور اس میں مدارس میں کام کرنے کے لیے استانیاں تیار کریں گے'' بعد ازاں ۱۹۰۶ء میں باقاعدہ سکول کا آغاز کیا گیا جو پہلا گرلز کالج بھی بنا اور اسی کے تحت بورڈنگ سکول بھی قائم کیا گیا۔

۳۔ مولوی ممتاز علی نے طبقۂ نسواں کے شعور و آگہی کے لیے ۱۸۹۸ء میں اپنی اہلیہ محمدی بیگم کی ادارت میں ''ہفتہ وار تہذیب النسواں'' کا اجرا کیا۔سر سید احمد خان کا ایک مکتوب بنام مولوی ممتاز علی اس رسالے کے اجراء کے حوالے سے ان کی رائے کا بذاتِ خود اظہار ہے۔

''۔۔چاہے آپ میرا مشوہ پسند نہ کریں مگر میں یہی کہوں گا کہ آپ عورتوں کے لیے اخبار جاری نہ کریں۔آپ یقین کریں کہ آپ اسے جاری کر کے پچھتائیں گے۔اور تکلیف، نقصان اور سخت بدنامی کے بعد آپ کو اسے بند کرنا پڑے گا۔۔۔میری رائے میں اگر کوئی اخبار مستورات کے لیے جاری کیا جائے تو اس کا نام ''تہذیب النسواں'' ہونا چاہیے''

سر سید احمد خان (مکتوب بنام مولوی ممتاز علی)، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ''تاج صاحب کے والدین''، مشمولہ مجلّہ صحیفہ، تاج نمبر، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، س۔ن، ص نمبر ۲۳

اس پرچے نے انیسویں اور بیسویں صدی کی خواتین کی فکری تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔اگر چہ اس سے پہلے مولوی سید احمد (مؤلف فرہنگِ آصفیہ نے) دہلی ''اخبار النساء (۱۸۸۷ء) اور منشی محبوب عالم (ایڈیٹر پیسہ اخبار) شریف بیبیاں'' (۱۸۹۳ء) میں جاری کر چکے تھے۔لیکن ''تہذیب النسواں'' کسی خاتون کی ادارت میں نکلنے والا پہلا اخبار تھا۔محمدی بیگم نے اس کے بعد ۱۹۰۴ء میں ایک اور رسالہ ''مشیرِ مادر'' (ماؤں کی رہنمائی کے لیے) جاری کیا۔بعد ازاں مؤخذ کر بھی ''تہذیب النسواں'' میں شامل کر دیا۔یہ رسالہ محمدی بیگم کے انتقال کے بعد مولوی ممتاز علی کی بیٹی ''وحیدہ بیگم'' کی ادارت میں پچاس سال تک کامیابی سے جاری رہا۔

۴۔ ۱۹۰۴ء کے وسط میں علی گڑھ سے تعلیم نسواں کی تحریک میں جان ڈالنے کے لیے رسالہ ''خاتون'' جاری کیا گیا۔۱۹۱۴ء

میں اس کا سفر ہو گیا۔
شیخ عبداللہ، سوانح حیات، بیگم عبداللہ، ص ۲۰

۵۔ مولوی ممتاز علی کی پہلی بیوی کے انتقال کے دو سال بعد ان کا عقد محمدی بیگم سے ہوا۔ ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے طبقۂ نسواں کی فلاح کا خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر نظر آنے لگی۔ انہوں نے محمدی بیگم کے لیے انگریزی تعلیم تک کا انتظام کیا اور ان کی صلاحیتوں کو اظہار کے مواقع فراہم کیے۔
محمدی بیگم نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کئی نظموں اور لوریوں کی کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں ''تاج گیت'' (ننھے بچوں کے لیے آسان گیت)، ''خواب راحت'' (دہلی کی مشہور لوریاں)، ''پان کی گلوری''، (پان کی تعریف میں ایک دلچسپ نظم)، شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لیے دو تصویری کہانیوں کے ساتھ سلیس اور دلچسپ کہانیاں بھی لکھیں۔ جن میں ''امتیاز پچیسی'' (پچیس آسان کہانیوں کا مجموعہ) اور ''دلپسند کہانیاں'' اور ''علی بابا چالیس چور شامل ہیں۔ ''تاج پھول''، ''ریاض پھول''، چوہے بلی نامہ''، تین بہنوں کی کہانیاں'' اسی طرح خواتین کی گھر بیٹھے تعلیم و تربیت کے لیے بھی کئی کتابیں تحریر کیں جن میں ''آدابِ ملاقات'' زنانہ میل جول کے مہذب طریقے،، ''رفیقِ عروس''۔ ''سگھڑ بیٹی''۔ ''مشیرِ مادر'' شامل ہیں۔ اسی طرح ''خانہ داری'' اور ''نعمت خانہ'' میں خواتین کو کھانا پکانے، گھریلو معاملات کو احسن انداز میں چلانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ ان کے تین ناول اپنے دور کے مسائل نمائندگی کرتے ہیں۔ ''صفیہ بیگم''، ''آجکل''، اور ''شریف بیٹی''، شامل ہیں۔

۶۔ شیخ عبداللہ، ''لیڈیز کانفرنس''، مشمولہ ''تعلیمی مضامین''، سلسلۂ انتخاب رسالہ الناظر لکھنؤ، مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ ص ۲۱۱،

۷۔ اور بھی چند اولڈ بوائز نوجوانوں نے اس مسئلہ پر تقریر کی لیکن پرانی تعلیم کے مسلمان کچھ اس طرف متوجہ نہ ہوئے۔ لیکن نواب محسن الملک مرحوم اس تحریک کے موافق تھے۔ سرسید اور ان کے دیگر احباب اس کے مخالف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب خواجہ صاحب سرسید سے ملنے گئے تو سرسید نے ان کی تعلیمِ نسواں کی حمایت کا مضحکہ اڑایا۔ اور ابھی وہ کمرے میں گھسنے بھی نہ پائے تھے، کہا کہ کیا تم پردے سے باہر نکل آئے ہو۔ مجھے یاد ہے کہ کسی موقع پر اس زمانے میں، میں نے بھی سرسید سے عرض کیا کہ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ضروری ہے۔ سرسید نے فرمایا کہ موجودہ طرز کے مدارس میں پڑھ کر لڑکیاں بداخلاق ہو جائیں گی اور ان کے دوست شمس العلماء حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی جو اس وقت ان کے پاس بیٹھے تھے کہا کہ میاں کیا تم لڑکیوں کے لیے مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہو، انگریزی مدارس میں پڑھ کر ہڑ دنگیاں ہو جائیں گی۔ (۲) ڈاکٹر شیخ عبداللہ، ''مشاہدات و تاثرات''، مرتبہ اطہر صدیقی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء، ص نمبر ۳۰۰۔۳۰۱

*۸۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ''تاج صاحب کے والدین''، مشمولہ مجلّہ صحیفہ، تاج نمبر، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، س۔ن، ص ۱۹

۹۔ مولوی ممتاز علی، ''حقوقِ نسواں''، مطبع رفاہِ عام، دارلاشاعت پنجاب لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲، ۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۴ ۱۱۔ ایضاً، ص ۶ ۱۲۔ ایضاً، ص ۸ ۱۳۔ ایضاً، ص ۱۲۔۱۳

۱۴۔ ایضاً،ص۱۱ ۱۵۔ ایضاً،ص۱۴

۱۶۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ''تاج صاحب کے والدین''، مشمولہ مجلّہ صحیفہ،ص۱۹

۱۷۔ مولوی ممتاز علی، ''حقوقِ نسواں''، ص۱۴،۱۵

۱۸۔ ایضاً،ص۹۱ ۱۹۔ ایضاً ۲۰۔ ایضاً،ص۸۹ ۲۱۔ ایضاً،ص۹۰

۲۲۔ پردے کے حوالے سے اس دور کے زنانہ اخبارات میں بھی بحث چلتی رہی، ''رفیقِ نسواں'' کے نام سے ایک خاتون مس تھوبرن کی ادارت میں ایک رسالہ نکلتا تھا۔اس رسالے میں اور ''تہذیب النسواں'' میں شائع ہونے والے مضامین بسا اقات مذاکرے کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔مس تھوبرن ایک مضمون میں پردے کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ

''۔۔۔۔ہندوستان کے لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ عورتوں میں روح نہیں ہوتی۔۔۔۔ہمارا خیال اس بارہ (بارے) میں کہ عورتیں مثل قیدیوں کے پرہ میں رکھی جاتی ہیں۔۔۔

مزید اس بارے میں لکھتی ہیں کہ

''ہم پردے اور حیاداری کو ایک چیز جانتے ہیں۔پردے کی کمی کو حیا کی کمی اور حیا کی کمی کو پردے کی کمی سمجھتے ہیں۔اب ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ہم لوگوں میں حیاداری نہیں ہے۔کیا انگلستان کی ملکہ میں حیاداری نہیں۔حیا دل کی نیکی سے تعلق رکھتی ہے اور وہ برقعے اور پردے کے ساتھ پہنی خواہ اتاری نہیں جاتی۔''

محمدی بیگم (ایڈیٹر تہذیب النسواں)، ''مس تھوبرن صاحبہ پردے پر''، مشمولہ مجلّہ '' تہذیب النسواں، ۲۰ جنوری ۱۹۹۸ء،ص نمبر۱۷

یہ بحث یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ۳۰ فروری کے ''تہذیب النسواں'' کے پرچے میں ایک مضمون نگار کنیز فاطمہ ملکہ انگلستان کے ذکر کو مس تھوبرن کے مضمون میں سیاسی حوالے سے پیش کرنے پر ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ مس تھوبرن نے حیاداری کے لیے ملکہ انگلستان کا ہی نام لکھا ہے تو اس کے معنے یہی نہ کہ ہمیں اپنے پہلے مضمون لکھنے کے لیے معافی مانگنی پڑے۔'' (تہذیب انسواں،ص۳۵)

۲۳۔ ایضاً،ص۸۴ ۲۴۔ ایضاً،ص۸۵ ۲۵۔ ایضاً،ص۹۳۔۹۴ ۲۶۔ ایضاً،ص۸۷

۲۷۔ ایضاً،ص۹۴ ۲۸۔ ایضاً،ص۹۲ ۲۹۔ ایضاً،ص۹۲۔۹۳ ۳۰۔ ایضاً،ص۹۸

۳۱۔ ایضاً،ص۹۵ ۳۲۔ ایضاً،ص۹۵ ۳۳۔ایضاً،ص۹۶ ۳۴۔ایضاً

۳۵۔ ایضاً ۳۶۔ ایضاً ۳۷۔ ایضاً ۳۸۔ ایضاً،ص۹۷

۳۹۔ ایضاً ۴۰۔ ایضاً،ص۱۰۰ ۴۱۔ ایضاً ۴۲۔ ایضاً،ص۱۰۴

۴۳۔ایضاً ۴۴۔ ایضاً،ص۱۰۷